بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(۱)

وہ شمعِ فروزاں جس نے مسلسل ۲۶ سال تک ترجمان القرآن کی محفلِ اشارات کو روشن رکھا، سال ڈیڑھ سال ٹمٹانے کے بعد آخر گل ہوگئی۔

ویبقیٰ وجہ ربك ذوالجلال والاکرام!

گوجرانوالہ سے ۴، ۵ میل شمال کی جانب بستی فیروز والہ میں، ۱۸ اپریل کو ساڑھے چار بجے شام نمازِ جنازہ پڑھنے والوں کی سات صفوں کے سامنے اس شخص کی میت رکھی تھی جسے پروفیسر عبدالحمید صدیقی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے علم و ایمان کا یہ آفتاب قبر کی گہرائی میں غروب ہوگیا۔ اب وہاں صرف مٹی کی ایک ڈھیری یہ بتانے کے لیے موجود ہے کہ یہاں محوِ خواب ہے وہ شخص جس نے کتنی ہی خوابیدہ روحوں کو جگایا ہوگا۔

ڈیڑھ سال قبل فالج کا حملہ ہوا تھا، لیکن ایک مخلص معالج کے علاج کی مدد سے اس اسیبی مرض کے شکنجے سے اُن کے اعصاب آہستہ آہستہ رہائی پانے چلے گئے اور ایک بار پھر وہ پبلک لائبریری میں کئی برس سے اپنی مخصوص شدہ نشست پر بیٹھ کر ترجمان القرآن کی ادارت اور قرآن و حدیث کے انگریزی تراجم کا کام کرنے میں محو ہوگئے۔ مگر گذشتہ عید الاضحیٰ کے قریب اُن پر مرض کا پھر حملہ ہوا۔ دل کا دورہ ہو یا فالج کا حملہ، ان جانکاہ بیماریوں کا دوسرا حملہ خطرناک ہوتا ہے۔ کم ہی لوگ بچ نکلتے ہیں۔ اسی حملے کا مقابلہ ادویہ اور نفسیاتی تدبیروں سے کیا جاتا رہا اور آنے والا حادثہ ٹلتا رہا۔ گویا موت تقدیر کی کمین گاہ میں ایک طرف بیٹھی مریض اور معالج کی واماندگی تدبیر کا تماشا کرتی رہی۔ آخر وہ بامرِ الٰہی ۱۸ اپریل کی صبح کو تین بجے کے قریب آئی اور چار بجے جھپٹی۔ آخری سانس نکلی اور

اُدھر مؤذن کی پکار سنائی دی — اللہ اکبر، اللہ اکبر!

اور عبدالحمید صدیقی کی شخصیت و روح اُس دن دار البقاء کو جانے والے قافلے کی صفِ اوّل میں شامل ہو کر خطِ افق کے اُس پار چلی گئی۔ اعزہ و احباب روتے چلاتے رہ گئے اور مرحوم کی بیوہ اور بچیاں مژگانِ حیات کے آنسو بن کر رہ گئیں۔

میرے ذہن میں یکایک قرآن کی وہ دردناک مگر بشارت سے لبریز آیت گونجنے لگی جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعبؓ بن عمیر جیسے نفاست پسند نوجوان کی نعشِ مبارک کو خاک و خون میں پڑے دیکھ کر پڑھا تھا:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ج فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ (الاحزاب ۲۳)

ترجمہ: ایمان والوں میں ایسے مردانِ کار شامل ہیں جنھوں نے اللہ سے باندھے ہوئے پیمان کو سچ کر دکھایا۔ پس اُن میں سے کوئی وہ ہے جس نے اپنی ذمہ داری کا (آخری سانس تک) حق ادا کر دیا۔ اور کوئی وہ ہے جو (ادائے فرض کے لمحۂ تکمیل کا) انتظار کر رہا ہے۔

ایفائے عہد تو جیتے جی حضورؐ پر ایمان لانے والے سارے ہی خوش نصیب مسلمان کر رہے تھے، مگر حق تو ادا جبھی ہو سکتا ہے کہ آدمی آخری لمحے تک ایمان کے تقاضوں کو پورا کر دکھائے۔ درمیان میں قدم قدم پر صدہا رہزن، ہزارہا جذبے اور کیدِ شیطانی کے صدہزار پھندے حائل ہیں جن کی وجہ سے کتنے ہی علم و تقویٰ کے خزانہ بردار ایک ذرا سے ہیر پھیر میں پڑ کر عمر بھر کی کمائی لٹوا بیٹھتے ہیں۔ کردار کی اُونچی چوٹیوں تک ہانپ ہانپ کر برسوں کی محنت سے پہنچنے والے لوگ دل کے کسی کھوٹ، نگاہ کی کسی خیانت، کمائی میں حرام کی آمیزش، ذہن میں کبر و کینہ کی کسی لہر اور معاملات میں ظلم کے کسی اقدام کی وجہ سے پل میں نیچے پٹخ دیے جاتے ہیں، بلکہ بعض سے تو سطحِ زمین پر ٹکنے کا اعزاز بھی چھن جاتا ہے۔ اور وہ سیدھے اسفل السافلین میں پہنچ جاتے ہیں۔ اللّٰھم احفظنا جمیعًا۔

ہمارے بھائی عبدالحمید صدیقی خدا سے باندھے ہوئے پیمانِ وفا کو تادمِ آخر نبھا گئے، اور انھوں نے تقاضائے ایمان سے ذرا انحراف نہیں کیا۔ (وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔ الاحزاب ۲۳)۔

صدیقی صاحب اور ہم سب کے گرد جو دنیا پائی جاتی ہے وہ ہمیشہ ایمان و مفاد کا میدانِ کشمکش رہی ہے لیکن جب سے اس پر مادہ پرستانہ تہذیب کا غلبہ ہوا ہے، لوگوں کے سینوں میں گویا صنم دولت کے مندر تعمیر ہو گئے ہیں۔ انبوہ کے انبوہ روپے کی تسبیح پڑھتے ہوئے معیارِ زندگی بڑھانے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لیے اپنی قوت صرف کر رہے ہیں۔ مادۂ نفسانیت کا نشہ چڑھا ہوا ہے۔ ترقی نام کی ساحرہ کندھوں پر سوار ہے۔ پیچھے سے ادنیٰ خواہشات غیر مرئی نیزوں کی انیاں چبھو چبھو کر رفتار بڑھانے پر مجبور کرتی ہیں، سامنے اسبابِ آرائش و آسائش کی ایک جنت دکھائی دیتی ہے۔ اس دوڑ میں عقیدے پامال ہو رہے ہیں۔ اخلاقی حدود اور قانون کے جنگلے ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں۔ اصول، روایات اور اقدار کے ٹکڑے الگ الگ ہو کر گر رہے ہیں، حلال کی کٹھن راہوں کو چھوڑ کر حرام کی آسان پگ ڈنڈیوں کو اختیار کیا جا رہا ہے۔

پھر اتنا ہی نہیں یہ ماحول جو معمولی سے معمولی درجے کے ایمان اور مسلک شرافت کے لیے سخت ناسازگار ہو گیا ہے، اس میں دوہری تہری آزمائش ہے اُس قافلہ بلاکشاں کے لیے جو معاشرے کا پورا نقشہ تبدیل کرنا چاہتا ہو۔ ---------- تمام الحاد پسند، تمام مغرب پرست، تمام اشتراکیت زدہ، تمام انحراف پسند اور تمام بڑے بڑے مفاد پرست عناصر، تبدیلی چاہنے والے علمبردارانِ اسلام کے خلاف علمی، صحافتی، سیاسی اور ادبی محاذوں سے برسرِ جنگ ہیں۔ اور وہ تمام اداروں اور ذرائع و وسائل کے دروازے ان پر بند کیے ہوتے ہیں جن پر اُن کی اجارہ داری قائم ہے اور اگر کوئی پہلے سے اندر آگیا ہو تو یہ عناصر اسے دھکیل باہر کرتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی کو معاشرے نے قلیل سے معاوضے کی جو پروفیسری دے رکھی تھی وہ بھی اس بنیاد پر واپس لے لی کہ ؎

اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

یہی دوہری تہری آزمائش پروفیسر عبدالحمید صدیقی کو درپیش تھی۔ ہمارا یہ مخلص رفیق نہایت غریبانہ حالات کے ساتھ اُٹھتا ہے اور زندگی کی ابتدائی منزل شعور ہی میں اپنا رشتہ تحریکِ اسلامی کے قافلۂ بلاکشاں سے استوار کر لیتا ہے۔ نہایت درجہ مشکل مالی حالات میں وہ باطل نظریات کے خلاف صبر و ثبات سے معرکہ آرا رہتا ہے۔ اس پورے معرکے میں نہ کبھی اس کی نگاہ دولت کے شعبدوں پر جاتی ہے، نہ اربابِ جاہ کے ایوانوں میں سائل بن کر داخل ہوتا ہے، نہ اُس کے قدموں کو یہ احساس حرکت سے روکتا ہے کہ اپنی ذات کے علاوہ بیوی اور بچیوں کی ذمہ داری بھی اس کے سر ہے۔ اگر زندگی کے تقاضے زیادہ بوجھ ڈالتے ہیں تو وہ اپنی دماغی مزدوری کی مقدار بڑھا دیتا ہے۔ دنیا کے دوسرے معاشروں میں دماغی محنت خاصے ثمرات دیتی ہے، لیکن یہاں تو اگر کوئی شخص سال بھر

میں ایک اچھی کتاب لکھے تو اُس کی خوش قسمتی ہوگی، اگر بیس سال میں اُسے اپنے ایک سالِ محنت کے مصارف مل جائیں۔

ایک شخص جس نے غریبانہ حالات کے باوجود، اپنے ایمانی معرکے کو شروع سے آخر تک بایں احوال جاری رکھا کہ بھاری محنت کر کے جائز ذرائع سے بمشکل اسے گذر بسر کے لیے روزی حاصل ہو سکی، اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے خدا سے باندھا ہوا پیمانِ وفا پورا کر دکھایا۔

پروفیسر صدیقی علی الصباح گوجرانوالہ سے بابو ٹرین (ملازمین اور مزدوروں کو لاہور لانے والی گاڑی کا عوامی نام) میں ہر روز لاہور آتے[1]، اسٹیشن سے پبلک لائبریری پہنچتے، وہاں دن بھر کام کرتے، ملاقات کرنے والے رفیقوں اور عہدوں پر فائز پرانے شاگردوں، اور اپنے قدردان دوستوں اور ناشرین کو وقت اور توجہ سے حصہ دیتے، پھر بھی وہ بہت کچھ پڑھ بھی لیتے اور لکھ بھی لیتے۔ آخری چند سالوں میں تو جبکہ مضمحل صحت کی وجہ سے ہفتے میں دو چار دن وہ لاہور رہی میں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہر جاتے تھے۔ وہ بیک وقت کئی بھاری بھرکم کام کر رہے تھے۔ میں اُن کے متعلق وہی بات کہوں گا جو کسی موقع پر اپنے متعلق کہی تھی کہ "میرا دماغ میرے جسم کو کھا رہا ہے"۔ بالکل اسی طرح برادرم حمید صدیقی کے حساس اور تخلیقی دماغ نے ان کی جسمانی قوتوں کو نچوڑ لیا تھا۔ آخر مادّہ کے بنے ہوئے دماغی خلیات ان کی کاوشوں اور نگارشوں، ان کے ذاتی مسائل اور ملک میں تیس سال تک اسلام اور جمہوریت اور شرافت اور امن اور انسانی حقوق کے خلاف اُٹھنے والے نت نئے طوفانوں کے کرب کا سہ گونہ بوجھ کہاں تک برداشت کرتے۔

انجام کار یہ لمحہ آگیا کہ علم کے پھول اور حکمت کے موتی جس دماغ سے فضاؤں میں بکھر رہے تھے، اس کی مشین چلتے چلتے یکسر جام ہو گئی۔

پروفیسر عبدالحمید مرحوم نے ایک بڑی فراوانی دے کر وہ خدمات انجام دیں جن سے نہ صرف آج ہم استفادہ کر رہے ہیں، بلکہ آئندہ نسلوں کے لاکھوں افراد کو اُن سے حصہ ملے گا۔

---

[1] ایک روایت کے مطابق خود ان کا کہنا تھا کہ تاروں کی چھاؤں میں گھر سے نکلتا ہوں اور تاروں کی چھاؤں میں گھر پہنچتا ہوں۔ بچے اُس وقت بھی سو رہے ہوتے ہیں، اور اِس وقت بھی۔

سیاسی اکھاڑے میں اُترنے کی ضرورت و اہمیت اپنی جگہ، مگر اس میں کشش (CHARM) بھی زیادہ ہے۔ آدمی کتنا بھی بے لوث ہو، اس کا ذہن اس دائرے میں آنے کے بعد اس کی جاذبیتوں کے اثر سے بچا نہیں رہ سکتا۔ آدمی کا اسٹیج پر آکر لمبا اوقات ہزارہا افراد کے مجموعوں کو مخاطب کرنا، اُن کے ذہنوں میں نفوذ پا جانا، اُن کے دلوں میں گھر کر لینا، اُن کو کمانڈ کرنا، تقریروں اور بیانوں کا اخبارات میں چھپنا اور ریڈیو اور ٹیلی وژن کی لہروں کے ذریعے دُور دُور تک منتقل ہونا، کیمروں کے شیشوں کا عشاق کی بے تاب آنکھوں کی طرح ہر طرف سے گھیر لینا، خواص و عوام کے وفود کا ملنا، انٹرویو لیے جانا، اہم شخصیتوں سے روابط، خود اپنے حلقۂ رفقاء میں اس کام کی قدر و قیمت کا اول درجے پر ہونا، اور خیر اندیشوں کی طرف سے پروجیکٹ کرنے کی مہم، دعوتیں اور ضیافتیں اور استقبالیے، یہ سارا کچھ کتنا دلچسپ ہوتا ہے۔ برادرم پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم جب پروفیسری کر رہے تھے تو میں سیاسی اکھاڑے میں تھا۔ (۱۹۴۸ء تا ۱۹۶۲ء) اور خدا کے فضل سے کسی لحاظ سے کچھ کم نہ تھا۔ بلکہ اُس وقت کی مخالف فضا اور مشکل حالات میں شاید میرے حصے کا فریضہ زیادہ ہی سخت تھا۔ بعونہٖ تعالیٰ بخوبی عہدہ برآ ہوا۔ میں اس کم گو اور انکسار پسند آدمی کو دیکھتا تھا تو جی چاہتا تھا کہ یہ صاحبِ مطالعہ و کاوش رفیق فکری سرد جنگ میں ہمہ تن لگ جانے کے بجائے سیاسی گرم جنگ میں بھی حصہ دار بنے اور خود میرے لیے ذاتی طور پر ایک اچھا ساتھی ہو، مگر عبدالحمید صدیقی مرحوم اپنے مسلک پر مضبوطی سے قائم رہے۔ میرے سامنے کتنے ہی اعلیٰ درجے کی صلاحیتیں رکھنے والے ادیبوں نے اپنی برسوں میں بنی ہوئی ادبی شخصیتوں کی قبائیں اُتاریں اور انتظامی عہدے سنبھال لیے۔ کیونکہ اپنے دائرے میں سیاست کاری، تقریر و خطابت اور انتظامی عہدہ داری کے مقابلے میں ادب تو تھا ہی خس و خاشاک کی طرح، اچھے خاصے علمی کام کرنے والوں کو بھی ویسی اہمیت نہ حاصل ہو سکی۔ ایسی فضا میں پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم کا اس عزم پر جم جانا کہ وہ براہ راست سیاسی لڑائی لڑنے والوں سے الگ دُور بیٹھ کر حکمت، افکار و تصورات اور دلائل و براہین کے اسلحہ تیار کریں گے، بہت بڑی بات ہے۔ ظاہری داد و ستد تو سیاسی محاذ کے جرنیلوں کو ملتی ہے، سارے خطابات اور تمغے ان کے لیے ہوتے ہیں۔ دُور کسی تہ خانے میں بیٹھ کر گولہ بارود تیار کرنے والے کو بہت دیر تک اعلیٰ درجے کا کام کرنے کے بعد بس دھیمی قسم کا ایک احترام حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے (اور شاید ایک آدھ بار میرے ترغیب دلانے کے باوجود) انہوں نے گوشۂ تنہائی میں کیے جانے والے اپنے خاموش کام کو نہ چھوڑا۔ یہ ایک طرح کی قربانی ہے اور بہت بڑی قربانی ہے، اور اسی کا ماحصل یہ ہے کہ آج ہمارے پاس مرحوم کے

قلم سے رقم شدہ متعدد کتابیں سیرت، تاریخ اسلام، فلسفہ، تاریخ، تعلیم اور مغربی تہذیب و ثقافت کے موضوعات پر انگریزی اور اردو میں موجود ہیں۔ ریاض الصالحین اور مشکوٰۃ اور مسلم شریف کے تراجم انگریزی میں کئے۔ انگریزی زبان میں انہوں نے قرآن کا ترجمہ مع تفسیری حواشی کے تیار کرنا شروع کیا اور غالباً بارہ پاروں تک کا کام ہو چکا تھا۔ (جن میں سے ۸ پارے شائع ہو چکے ہیں) کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی ارضی زندگی کے دورِ امتحان کو ختم کر دیا۔ علاوہ ازیں بہت سے مضامین کا انگریزی زبان سے ترجمہ کیا۔ بے شمار کتابوں پر تبصرے لکھے، ترجمان القرآن کے سیکڑوں اشارات خوبصورت علمی انداز میں لکھتے ہوئے دینی حقائق کی روشنی میں سیاسی احوال کا ناقدانہ تجزیہ کیا۔ یہ ایک مستقل مدرسہ تھا جس کے تحت ہر ماہ ہزاروں قارئین کی ذہنی تربیت ہوتی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ اگر پروفیسر عبدالحمید صدیقی پارلیمانی ممبر ہوتے بلکہ وزیر بن جاتے تو دینی علم اور فکر صالح کا یہ سدا بہار گلشن آراستہ نہ ہو سکتا۔ یہ تو صدقہ جاریہ ہے۔ ایک چشمہ ہے جو ہمیشہ بہتا رہے گا۔ اور کھیتیاں اس سے سیراب ہوں گی۔ سیاست و صحافت میں معرکے انجام دینے والوں کو (اور انہوں نے بھی راہ حق کے لیے جو کام کیے اس کی بھاری جزا اُن کو ملے گی) اگر کبھی لوگ فراموش بھی کر دیں تو رفیق محترم عبدالحمید صدیقی اپنی کتابوں کے پیکر میں تا دیر لوگوں کے سامنے رہیں گے۔

غلبۂ حق کے لیے ان کی دماغی کاوشوں کو خداوند کریم قبول فرمائے اور اُن کی لکھی ہوئی ایک ایک سطر میں غیر معمولی اثر بھر دے۔

میرے سامنے بہت سے احباب نے اظہار افسوس کرتے ہوئے اُن کی علمی خدمات کا ذکر کیا۔ مگر میری نگاہ میں ان خدمات سے بڑھ کر ایک چیز اور ہے جو مرحوم کی پیشانی کو آخرت میں نور پاش بنا دے گی۔

وہ تحریک اسلامی کے اخلاقی تقاضوں کے مطابق انسانیت کا پرکشش نمونہ تھے۔ میں خاص طور پر اس پہلو کا ذکر اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ ہم کہیں ہنگامہ ہائے نو بنو سے گذرتے ہوئے اس سے غافل نہ ہو جائیں۔ میرے نزدیک اسلامی شعور کے تحت کسی شخص میں سب سے پہلے دیکھنے اور اس کی قدر و قیمت مقرر کرنے کے لیے یہی پہلو ہے کہ اس نے رفیقوں اور رقیبوں کے ساتھ مختلف معاملات نبھاتے ہوئے پیچ در پیچ رابطوں کے جنگل کو کس طرح عبور کیا۔

تحریک اسلامی کا اگر کوئی تصوف ہو سکتا ہے تو مرحوم اس کا بہترین نمونہ تھے۔ احباب کے لیے محبت کیش، اغیار کے لیے بے ضرر، مفاد و عناد کے چکروں سے مجتنب، رشک و حسد اور کینہ و کد سے محفوظ (باقی بر صفحہ ۳۳)

(بقیہ اشارات) کبر و خود بینی سے دُور، خوگرِ سکوت اور انکسار پسند ——— مگر ان اوصاف کا ایک ایسا صحت مند نمونہ جو فکری دائرے میں باطل کے خلاف بغیر کسی مداہنت و رعایت کے مصروفِ پیکار رہتا۔ نہ اس نے ترکِ ستیز کی راہ اختیار کی، نہ جمود و یاس کی پرچھائیں اپنے اُوپر پڑنے دی۔

سچے مسلمان کا مسلک خدا کی عبادت کے ساتھ اس کے بندوں کی خدمت سے عبارت ہے۔ ان کے سلوکِ خدمت کے مظاہر کئی تھے۔ اپنے ذوی القربیٰ میں سے کسی کو بھی مالی تکلیف کا سامنا ہوتا تو وہ اس تکلیف کو اپنے کھاتے میں ڈال لیتے۔

رشتہ داروں سے باہر بھی بعض اہلِ احتیاج کے لیے انہوں نے چھوٹی چھوٹی رقوم بہ طور وظیفہ مقرر کر رکھی تھیں۔ مرنے سے دو ایک روز پہلے ایسے ہی ایک شخص کو اس کا "حق معلوم" ادا کیا۔ بہت سے طلبہ کی فیسوں کی ادائیگی یا کتابوں کی خریداری کے لیے اُن کی طرف سے باقاعدہ مدد ملتی، اور اس کام کے لیے بعض مخیر حضرات اُن پر پورا اعتماد رکھنے کی وجہ سے چیکے سے رقوم اُن کے حوالے کر جاتے تھے۔ وہ آمد و خرچ کی تفصیل اپنے پاس نوٹ کر لیتے تاکہ جب کوئی چاہے حساب دریافت کر لے۔ گوجرانوالہ سے لاہور کے درمیان سفر کرتے ہوئے وہ کبھی تو حلقۂ درسِ قرآن کا اہتمام کر لیتے، اور کبھی کالجوں کے ہم سفر طلبہ کو (جن میں سے اکثر پروفیسر صاحب کو جانتے تھے) اُن کے اسباق سمجھانے اور ان کی مشکلات حل کرنے میں مدد دیتے۔ گویا یہ متحرک سفری درس گاہ ہوتی۔ خدمت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ بسا اوقات بابو ٹرین کے اکھڑ مزاج نوجوان مسافروں کے درمیان کوئی اکا دکا خاتون گھر جاتیں اور انہیں تنگ کیا جاتا تو وہ اگر کبھی گارڈ سے شکایت کرتیں تو وہاں سے بتایا جاتا ہے کہ اس گاڑی میں صرف ایک جگہ ہے جہاں تمہارا تحفظ ہو سکتا ہے ——— وہ کمپارٹمنٹ جس میں پروفیسر عبدالحمید صدیقی بیٹھتے ہیں۔ اور ان کا کمپارٹمنٹ سب کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ پاک دل و پاک نظر آدمی کہاں بیٹھتا ہے۔ اور خدمت کی ایک راہ یہ بھی تھی کہ تحریکی رفقا اور ذاتی دوست پبلک لائبریری میں کام لے کر اُن تک پہنچتے۔ کام اگر ایسے محکمے یا دفتر سے متعلق ہوتا جہاں پروفیسر صاحب کا کوئی سابق شاگرد کسی عہدے پر بیٹھا ہوتا ——— اور ایسے لوگ کئی محکموں میں تھے ——— تو وہ بلا تامل کام اس کے پاس بھجوا دیتے یا اگر مناسب آدمی ان سے لائبریری میں آکر ملنے والا ہوتا تو اس کی آمد تک ملتوی رکھتے۔

مرنجاں مرنج ہونے کا محاورہ ان پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ کم سے کم میرے علم میں ایسا نہیں ہے کہ کسی شخص سے ان کی تناتنی یا رنجش چل رہی ہو، کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے انہوں نے کبھی سوچا تک بھی ہو یا کسی کے

لیے ایسے ناخوشگوار جذبات کا اظہار کیا ہو یا ایسے اذیت ناک الفاظ استعمال کیے ہوں کہ اُن کے نتیجے وہ چیز مستقلاً پیدا ہو جاتے جسے غِلّ کہتے ہیں، اور جو بسا اوقات مرجانے کے بعد بھی نہیں چھوڑتی - اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ اہل ایمان صالحین کو جنت میں لیا جائے گا تو اُن کے سینوں میں اگر کوئی غلط فہمی یا احساسِ اذیت یا منافرت وغیرہ کا شائبہ ہوگا تو اسے صاف کر دیا جائے گا۔ (وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ - (الاعراف ۴۳ الحجر ۴۷)۔

بہ حیثیت انسان مرحوم رفیق کی بڑائی کی ایک علامت یہ ہے کہ مجھے جب کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تو چند لمحوں کے لیے ان کی محبت و عنایت کی وجہ سے اپنے اندر عزت اور اہمیت کا احساس ہوا۔ بعض لوگوں کے پاس آدمی بیٹھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ وہ کچھ چھوٹا ہو گیا ہے، بعض کی ہم نشینی سے برابری کا تصور ملتا ہے، خاص خاص لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اگرچہ بڑے وہ خود ہوتے ہیں، مگر وہ اپنے پاس بیٹھنے والوں میں برتری کا احساس پیدا کر دیتے ہیں - بڑا ہوتے ہوئے اپنے رویّے سے چھوٹے چھوٹے ہم نشینوں کو بڑا بنا دینا، یہ ایک ایسا مقام ہے جو شاذ و نادر کچھ لوگوں کو حاصل ہوتا ہے - عبدالحمید صدیقی اسی مقام پر فائز تھے۔

انسان اور انسان کے درمیان آج اتنی دیواریں کھڑی ہیں کہ لوگ مل بیٹھ کر بھی جدا رہتے ہیں - ہر شخص اپنی کچھ دیواریں ساتھ لیے پھرتا ہے - یہ دیواریں دولت اور سٹیٹس اور معیارِ زندگی اور باہمی کشاکش اور بے اعتمادی اور حقیقی محبت کے بجائے محبت کی ایکٹنگ اور ڈیل کارنیگی ازم اور تعلقات کو مطلب برآری کا ذریعہ بنانے کے مسالے سے تعمیر ہوتی ہیں - یہ غیر مرئی دیواریں ان دوستیوں اور تعلقات اور ملاقاتوں کو اس اثر سے خالی رکھتی ہیں کہ دو یا زیادہ افراد باہم بھائی بھائی بن سکیں - خدا مغفرت سے نوازے پروفیسر عبدالحمید صدیقی کو جو اوّلین کلمۂ خطاب "بھائی جان" کہہ کر ان دیواروں کو کالعدم کر دیتے تھے - اور ان کا لہجہ بے حد ملائم اور غیر مصنوعی ہوتا۔

بہ حیثیت انسان ——— اور تحریک اسلامی کے انسان ——— کے اُن کا معیارِ ترجیح ہم لوگوں سے مختلف تھا - ہم مرکز سے متعلق رفیقوں میں سے شاید وہ مرتبۂ اوّل ملک غلام علی صاحب کو دیتے تھے، کیونکہ وہ اُن کے علم و تقوٰی کے مقام سے آگاہ تھے - خود میری رائے میں پہلے نمبر پر ملک غلام علی صاحب اور دوسرے نمبر پر پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم، اس لحاظ سے بڑی روشن مثالیں ہیں کہ دونوں نے برسوں کی کاوشوں سے اپنے علم میں اتنا اضافہ کیا کہ دونوں کی بات میں بڑا وزن پیدا ہوا - ملک غلام علی صاحب نے اگرچہ جان ماری اور عرق ریزی نہ کی ہوتی

تو آج ہمارے درمیان ایک شخص بھی ایسا نہ ہوتا جو اصولی اور وقتی مسائل میں تفسیر، حدیث اور فقہ کے دلائل اور حوالوں کے ساتھ دقیع رائے دے سکتا۔ کاشکہ دو چار رنگ غلام ہمارے ہاں اور ہوتے۔ اور یہی بات پروفیسر عبدالحمید صدیقی کے لیے کہی جا سکتی ہے۔ ایسے ہی لوگ تحریکِ اسلامی کا اصل جوہر ہیں۔

ٹھیک ہے کہ ہمارے ہاں انشاءاللہ علمی خدمات بھی انجام پائیں گی۔ کتابیں مرتب ہوتی رہیں گی، سیاسی معرکے جاری رہیں گے۔ مگر عبدالحمید صدیقی جیسا دوسرا آدمی مرحوم کی جگہ کو پُر کرنے کے لیے ہمیں میسّر ہوگا یا نہیں ——— کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ تحریک اسلامی کی قوت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہمارے اندر سے اخلاقی جگمگاہٹ رکھنے والے ایسے انسان مسلسل اُبھرتے رہیں جیسے عبدالحمید صدیقی تھے اور اُن کو اوّل درجے کی قدر و قیمت حاصل ہو۔ اگر یہ نہ ہوا تو پھر اگر فرمانروائی بھی مل جائے تو بھی تحریکِ اسلامی کے اصل مقاصد پورے نہ ہو سکیں گے۔

مرحوم کی ایک خوبی اُن کا حلم اور صبر تھا اور یہ جوہر اتنا رچا بسا ہوا تھا کہ چال بھی دھیمی تھی۔ (یمشون علی الارض ھونًا - الفرقان - ۶۳) اور قال میں بھی ایسا ٹھہراؤ کہ "نرم دمِ گفتگو" کا اطلاق ہوتا تھا۔ آواز بھی متوسط سطح سے کچھ کم ہی رہتی۔ (واغضض من صوتك - لقمان ۱۹) خاص طور پر آدمی کے صبر و حلم کی جانچ مرحلۂ اختلاف میں ہوتی ہے۔ بعض لوگ اپنی "انا" کے دباؤ سے بھی بات بات میں اختلاف کرتے ہیں، اختلاف کو زور سے بیان کرتے ہیں، لفظوں میں بھی زور، لہجے اور آواز میں بھی زور۔ پھر چاہتے ہیں کہ لازماً اُن کی بات چلے، اور بات چل جائے تو دل میں فتح مندی کا احساس اُبھرتا ہے۔ یہی پگڈنڈی ہے جو مناظرے اور مجادلے کی وادیوں تک لے جاتی ہے۔ ہمارے مرحوم بھائی اس معاملے میں بڑی مختلف ساخت کے تھے۔ اوّل تو کثرتِ اختلاف کا مرض نہ تھا۔ ہر چھوٹے موٹے اختلاف کو ہر قسم کے موقعوں پہ میدان میں اُچھال دینے کی عادت نہ تھی، جہاں ضروری ہوتا وہاں اپنی رائے کے طور پر اختلاف کو عام لہجے میں مختصراً بیان کر دیتے۔ اور اُن کے جذبات کی فوجیں حرکت میں نہ آتیں۔ ان کی کوشش یہ نہ ہوتی کہ دوسروں سے کسی نہ کسی طرح اپنی بات منوانا ہے۔ کسی نے کچھ سمجھ لیا تو بہتر، نہیں تو خوبصورتی سے بات کا رُخ کسی دوسری طرف موڑ دیا۔ انسان میں لمحۂ اختلاف کی شائستگی کا پیدا ہونا بہت بڑی تربیتِ نفس چاہتا ہے۔ نفسانیت گفتگوؤں کے موقعوں پہ پھنیر سانپ کی طرح دبک کر پس منظر میں موجود رہتی ہے۔ جونہی کوئی اختلافی مبحث چھڑا وہ اچانک اپنا پھن پھیلائے پھنکارتی ہوئی سامنے آجاتی ہے

پروفیسر عبدالحمید صدیقی کے اندر ایسا پھنیر سانپ تو کیا، کوئی حقیر سا سپنولیا بھی نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ بعض معاملات میں جزوی طور پر انہیں مجھ سے بھی اختلاف ہوا ہے، مگر اس کے ساتھ ان کی محبت اور اُن کے حسن ظن میں جو وہ میرے لیے رکھتے تھے کبھی فرق نہیں آیا۔ اختلاف انہیں دوسروں سے بھی ہوتے رہے ہیں، جماعت کے بعض اکابر اور بعض عہدہ داروں سے بھی، بعض پالیسیوں اور فیصلوں سے بھی، لیکن جس طرح ان کے "اشارات" پر ایسے کسی اختلاف کا پرتو موجود نہیں ہوتا تھا، اسی طرح ان کی طبیعت پر بھی کوئی مستقل اور گہرا اثر باقی نہیں رہتا تھا۔ نہ کسی کے لیے اُن کے دل میں مستقل ناپسندیدگی پیدا ہوتی، نہ کسی سے بُعد! کیا شان ہے ایک مخلص مسلمان کے قلب و ذہن کی! سبحٰن اللہ!

مرحوم کے لیے مغفرت کی دُعا کرنے سے پہلے میں تین ضروری باتیں کہنا چاہتا ہوں:

اوّلاً یہ کہ مرحوم نے اپنی بیوی اور بچیوں کی شکل میں جو ذمہ داریاں (LIABILITIES) چھوڑی ہیں، اُن کے ساتھ غالباً کوئی خاص اثاثہ نہیں چھوڑا ہوگا۔ یہ ذمہ داریاں درحقیقت اب ہم سب کی ذمہ داریاں ہیں۔ ایک بھائی تحریک اسلامی کی خدمت کرتے کرتے گھُل گھُل کر ختم ہوگیا ہے تو اب اس کے خلاء کو پُر کرنا ہم سارے بھائیوں کی ذمہ داری ہے۔ ساری تحریکی برادری ان ذمہ داریوں کی وارث ہے۔ اس سلسلے میں غالباً پہلے ہی سے کام ہو رہا ہوگا، اس لیے اس پر تفصیل کی ضرورت نہیں۔

ثانیاً دو تین افراد مرحوم کی ذاتی لائبریری کی لسٹ بنائیں، اور ان میں سے گھر کے لوگ جو کتابیں رکھنا چاہتے ہوں اُن کے علاوہ بقیہ تمام کتب کی قیمت لگوا کر انہیں جماعت کی مرکزی (یا گوجرانوالہ کی) لائبریری کے لیے خرید لیا جائے۔

یہی حضرات ان کی مطبوعہ کتب کی لسٹ بھی بنائیں اور غیر مطبوعہ مسودات (اور اہم خطوط) کی فہرست تیار کر کے رائے قائم کریں کہ کونسی چیزیں علیحدہ یا کسی مجموعے کی شکل میں شائع ہونے کے قابل ہیں۔

پھر کسی ایک قابل اعتماد پبلشر سے بات کر کے ایسی شرائط پر تمام کتابوں اور مسودات کے حقوق اشاعت دیے جائیں جن کی رُو سے رائلٹی کی رقم کا بڑا حصہ مقررہ ماہانہ اقساط کی شکل میں مرحوم کے لواحقین کو ملتا رہے، اور سالانہ حسابات کرنے پر اگر مزید رقم نکلے تو ادا کر دی جائے، ورنہ اگلے سال کی اقساط میں سے منہا کر لی جائے۔

ثالثاً کوئی دو ایک موزوں اصحاب اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیں کہ مرحوم کی سوانح حیات کے ساتھ اُن کے

علمی کام کا مفصل جائزہ شائع کرائیں۔ اگر ضروری ہو تو اُن کے اہل خانہ اور اُن کے برادران، ان کے شاگردوں، اُن کے معاصر و دوست اساتذہ اور اُن کے پبلشرز سے انٹرویو بھی لیے جائیں۔ ان میں کوئی انٹرویو مستقلاً بھی لیا جاسکتا ہے، بقیہ کے مواد کو سوانح نگاری میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی کہ ہم جدا ہونے والے ساتھیوں کو ایک ایک کر کے فراموش کرتے جائیں، یہاں تک کہ بعض اول درجے کی قیمتی شخصیتوں کا کبھی تذکرہ تک ہماری رسمی اور غیر رسمی مجالس اور جرائد اور نگارشات میں نہ آئے۔ گویا جو اپنا دورِ عمر پورا کر جائے اس کی پوری شخصیت کو وقت کے تیز رو دریا میں بہا دیا جائے۔ گذرے ہوئے ساتھیوں کے حق میں یہ طرزِ عمل موجودہ ساتھیوں پر بُرا اثر ڈالتا ہے۔

بلکہ میری خواہش (جسے میں خود پورا کرنے کے قابل نہیں ہوں) یہ ہے کہ اُن ساری شخصیتوں کے تذکرے پر مشتمل ایک وقیع مجموعہ تیار کیا جائے جو اب تک ہم سے جدا ہو چکے ہیں (مثلاً "ساتھی جو جدا ہو گئے" جیسے کسی عنوان سے)۔

آخر میں ہم جدا ہونے والی مبارک روح سے یہ کہتے ہوئے کہ "ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیہ" خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بچھڑ جانے والے پیارے بھائی عبدالحمید صدیقی کو صدیقین و شہداء اور صالحین کے اُس گروہ میں شامل کرے جو انبیاء کے گرد جمع ہے۔ خدا اس نیک نہاد بندے کی قبر کو کشادہ اور منور کرے، خدا اسے شفاعتِ پیغمبر آخر الزماںؐ کی برکت سے مغفرت بغیر حساب نصیب کرے۔ اللہ تعالیٰ اُس کے کام کو اس کے لیے صدقہ جاریہ بنا کر ہر آن اس کے اعمال میں ثواب کا اضافہ کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کی تحریروں کی برکت سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ایمان با عمل کی نعمت سے نوازے۔ وہ مرحوم کی وفات سے تحریک اسلامی میں پیدا ہونے والے خلاء کو بہترین شکل میں پورا کرے۔ وہ ہمیں اور جملہ رفقائے تحریک کو توفیق دے کہ ہم ان کی تحریروں اور اُن کی عملی مثال سے استفادہ کر کے بہتر مرتبے کے انسان بنیں۔ خدائے رحمٰن و رحیم صدیقی مرحوم کے لواحقین کے لیے خود بہترین سہارا بنے اور اُن کو اور اُن کے خاندان بھر کے اعزہ و اقربا کو اُن کے سے ایمان و علم اور اُن کے سے کردار و تقویٰ کا وارث بنائے۔ آمین!

ادارۂ ترجمان القرآن کا ہر فرد اس دعا میں شریک ہے۔ قارئین کے وسیع حلقے سے درخواست ہے کہ آپ تمام احباب بھی مرحوم کے لیے نمازوں کے ساتھ خاص طور پر مغفرت کی دعا مانگیں۔

---

(۲)

انقلاب افغانستان ہمارے بالکل قریب واقع ہوا ہے، مگر خبروں اور معلومات کے لحاظ سے دیکھیں تو جیسے ہزاروں میل دور کا قصہ ہے۔ خبریں، بیانات، اعلانات، تصویریں اور رپورٹیں برابر چلی آرہی ہیں، مگر اب تک نہ تو تمام جزوی تفاصیل کے بارے میں تیقن سے صحت و عدم صحت کا حکم لگایا جا سکتا ہے، نہ داستانِ انقلاب کی پوری کڑیاں نگاہوں کے سامنے ہیں، نہ یہی اندازہ ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ ان وجوہ سے پوری طرح تبصرہ کرنے کا موقع ابھی نہیں آیا۔

صرف دو تین سبق آموز پہلوؤں کو اجمالاً پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ ایک ایسا مسلمان ملک جس کی بھاری اکثریت میں اسلام سے اعتقادی، جذباتی اور روایاتی وابستگی باقی تھی۔ اس کا بہترین سامانِ تحفظ اسلام ہی ہو سکتا تھا۔ مگر حکمرانوں نے مسلمان ہونے کے باوجود اسلام کو جامد مذہبیت کی شکل دے کر مسجدوں میں دھکیل دیا تھا۔ اجتماعی زندگی سے اس کا ذرا سا تعلق تھا بھی تو وہ چند پرائیویٹ سماجی تقاریب کی حد تک تھا۔ اس کی حکمتِ حیات، اس کے سیاسی و معاشی اصولوں اور اس کے تہذیبی تقاضوں کو بے جان اور رسمی کر دیا گیا تھا۔ اس کی تحریکی انقلابی روح سلب کر لی گئی تھی۔ نظامِ حکومت اسلام سے آزاد تھا، قانون و تعزیرات کا ڈھانچہ اس سے آزاد تھا۔ معاش اور معاشرت اور تہذیب کی نشوونما اس سے آزاد تھی، تعلیم اور قومی مالیات اور دفاع کے دائرے اس سے آزاد تھے۔ ایسے حالات میں اسلام جیسی عظیم قوت ایک مسلمان قوم کو تاریخی آفات سے تحفظ کیسے دے سکتی تھی۔

افغانستان میں اگر اسلام تحریکی شان کے ساتھ کارفرما ہوتا، لوگ شعوری ایمان سے آراستہ ہوتے، افغانستان سے روشنی کی کرنیں پھیل کر باہر کے اسلامی اور غیر مسلم ممالک میں پہنچ رہی ہوتیں۔ باہر سے مسلم علماء اور غیر مسلم محققین اس سرچشمۂ حکمت سے استفادہ کے لیے آ جا رہے ہوتے، زندگی کے شعبوں کی اٹھان احکامِ قرآن اور سنتِ رسولؐ کی اساس پر ہو رہی ہوتی تو کوئی غیر اسلامی نظریاتی قوت اپنے لیے آلۂ کار حاصل نہ کر سکتی۔ کہیں سے بھی آئے ہوئے ماہرین ایمان و اخلاق کے قلعے میں نقب نہ لگا سکتے ۔ مگر اسلام کے ساتھ جو سلوک عرصۂ دراز سے بادشاہت نے روا رکھا تھا۔ اس کے انتقام کا سب سے پہلا نشانہ وہی بنی اور اس کے ساتھ وہ پوری قوم بھی ایک خوفناک آزمائش سے دوچار ہو گئی جو سالہا سال سے غیر اسلامی بادشاہت کے آگے سرافگندہ

چلی آ رہی تھی۔ اور اُسے برطرف کرنے کے لیے اس کے پاس قربانیوں کی کوئی تاریخ نہ تھی۔

اس پہلو سے ایک اہم سبق دُنیا بھر کی مسلم اقوام اور اُن کی حکومتوں کے لیے موجود ہے، اور یہ سبق ہم پاکستانیوں کے لیے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم بھی عرصہ دراز سے اسلام کے ساتھ کھیل تماشا کرتے چلے آ رہے ہیں اور اس کا حق ادا کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ یہ عظیم قوت جو ہزار آفات سے ہمیں بچا سکتی ہے اُسے ہم نے اس قابل بننے ہی نہیں دیا کہ وہ ہمارے لیے فولادی قلعہ ہو۔ اب بھی تلافی کا وقت ہے اور بہت تھوڑا وقت ہے۔ اگر ہم اپنا تحفظ چاہتے ہیں تو شعوری ایمان کے ساتھ تحریک اسلامی کو اُبھاریں۔ اور اس کے زور سے جلد از جلد اسلامی نظام عدل و رحمت کو برپا کریں۔ ورنہ محض سیاسی چالوں اور سفارتی حیلوں حوالوں اور بڑی قوتوں کے گھٹنے چھونے سے قضا نہیں ٹل سکتی۔

۲۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ اسلام سے ہٹ کر انسانوں کے ایجاد کردہ نظاموں اور تہذیبوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو بنیادی طور پر تعلیم و تلقین سے اپنا راستہ بنائے۔ بخلاف اس کے مکر و سازش اور جبر و بہیمیت ہی ان کا طریق کار رہے۔ باطل نظریوں اور نظاموں کا یہی نشان ہے۔ مغربی مادہ پرستی ہم پر مسلط ہو گئی تو اس امپریلزم کے ذریعے جس نے مزاحمت کرنے والی واحد مسلم قوم کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ اب جن مسلم ممالک میں اشتراکیت کے تجربے ہوئے ہیں۔ ان میں بھی بڑا خون خرابا اور بڑا بے رحمانہ تشدد ہوتا رہا ہے۔ یہی حال انقلاب افغانستان کا ہے۔ نام تو جمہور کا لیا جا رہا ہے، جیسے کہ چند مہینوں اور ہفتوں سے جمہور کسی تبدیلی کا مطالبہ کر رہے تھے اور کوئی تحریک چلا رہے تھے۔ اور اب اُن کی مساعی برگ و بار لائی ہیں۔[1]

فوج کا ایک دھڑا اُٹھتا ہے (ساری فوج بھی یکسو نہ تھی) اور بے شمار افراد[2] گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں

---

[1] اس کی مثال ہمارے یہاں کی تحریک ۱۹۷۷ء ہے جس میں شہر شہر، قریے قریے عوام سڑکوں پر نکل کھڑے ہوئے۔ یہ بات خاص طور سے نوٹ کرنے کی ہے کہ اتنی بڑی تحریک کے لاکھوں افراد نے ظلم کو شکست دینے کے لیے ظلم سہنے کا طریقہ اختیار کیا۔ خود ظلم اور تخریب اور تباہ کاری کی راہ اختیار نہ کی۔ یہ اس وجہ سے کہ تحریک نظام مصطفیٰ کے نعرے سے چلی تھی۔ اسلامی قوت کا راستہ ظلم نہیں صبر ہے۔

[2] نور محمد ترہکی نے کل کی پریس کانفرنس میں کہا ہے کہ یہ تعداد صرف ستر ہے۔

شاہی خاندان کے معاملے میں بھی نوبت یہاں تک پہنچی کہ عورتوں اور بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ صدر داؤد کی لاش کو گھسیٹے جانے کی خبر بھی آئی ہے۔ جانیں بچانے کے لیے چھپ جانے والے جن لوگوں کو بذریعہ اعلان انقلابی کونسل کے سامنے پیش ہونے کے لیے کہا گیا تھا، اُن کی ایک تعداد واپس آئی تو کسی تحقیقاتی کارروائی کے بغیر گولیوں سے اُڑا دیا گیا۔ انسانوں میں شرف انسانیت کا جو جوہر رکھا گیا ہے، وہ بھی کام نہ کر سکا۔ اور ساری دُنیا میں یہی ہو رہا ہے، ویت نام اور کمبوڈیا کی جنگ میں، اسرائیل میں (شروع سے اب تک) بھارت میں (فسادات کی صورت میں) قبرص میں (چند سال قبل کے واقعات) برما میں (مسلمانوں کے خلاف) غرض جدھر بھی دیکھیے، بالکل حیوانات کی طرح ظالمانہ کارروائیاں ہوتی ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ غیر اسلامی نظریات و تحریکات نے انسانوں کو ان روحانی و اخلاقی خوبیوں سے خالی کر دیا ہے۔ جن سے جوہر انسانیت تشکیل پاتا ہے مادہ پرستانہ ذہن کے ساتھ جنگ کرنے والوں اور انقلاب لانے والوں کی اخلاقی سطح ویسی ہی ہو گئی ہے جیسی ہائی جیکروں، اغوا کر کے یرغمال بنانے والی تنظیموں اور خرکاروں کی ہوتی ہے۔

اُٹھا کر دیکھیے تاریخ کہ عیسائی فاتح بن کر بیت المقدس میں داخل ہوتے ہیں تو مسلمانوں پر کیا گذرتی ہے۔ اور اسی بیت المقدس میں سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح بن کر داخل ہوتا ہے تو کیسا سلوک کرتا ہے عیسائی آبادی کے ساتھ۔ معلوم ہوا کہ جہاں اسلام کارفرما ہوتا ہے وہاں انسانی شرف کام کرتا ہے۔ اور جہاں کوئی دوسرا نظریہ اثر انداز ہوتا ہے وہاں شرفِ انسانیت کا فقدان ہوتا ہے۔

بہیمانہ مظالم کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے، کیونکہ انقلابی حکومت کے سربراہ نور محمد ترہ کی نے اعلان کیا ہے کہ عوام کو چاہیے کہ وہ سابق حکومت اور نظام کے حامیوں کو گرفتار کرائیں۔ جوں جوں یہ لوگ گرفتار ہوں گے، ظلم کی چکی گھمر گھمر چلتی رہے گی۔ ان کارروائیوں کے اندر سے نہ جانے کس طرح اسلام برآمد ہو جائے گا، یا جمہوریت نمودار ہو جائے گی۔

سبق یہ ہے کہ مکر و سازش اور ظلم و بہیمیت کی راہ سے آیا ہوا کوئی بھی انقلاب انسانیت کو فلاح نہیں دے سکتا۔

۳۔ یہ بھی بڑی پیچیدہ بات ہے کہ جس حکومت کے تمام کے تمام عمائد کمیونسٹ ہوں، اس کا کمیونسٹ سربراہ یہ پالیسی بیان کرتا ہے کہ انقلابی حکومت، اسلام، جمہوریت اور فرد کی آزادی کے لیے کام

کرنا چاہتی ہے[۱]۔ اغلباً مسلمان ممالک میں کام کرنے کے لیے اب یہی گائیڈ لائن اُوپر سے دی گئی ہے کہ جیسا دیس ویسا بھیس کے اصول پر انقلاب کے قامت پر کوئی بھی مناسب جامہ فٹ کر لیا جائے۔

بہر حال یہ ایک تضاد ہے۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ اسلام سے وابستگی رکھنے والی اکثریت اور اُن کی قیادت کرنے والے ملایان قہستانی کو تھوڑا سا بہلا کر آہستہ آہستہ کام کیا جائے۔ سمرقند و بخارا کا بھی ایک تجربہ تھا، اور اب مصر اور صومالیہ کا بھی ایک تجربہ سب کے سامنے ہے۔ دیکھیے کہ افغانستان کا تجربہ کیسا رہتا ہے۔

تضاد جہاں تیزی وطراری کا آئینہ دار ہوتا ہے، وہاں یہ کمزوری کا بھی مظہر ہے۔

اگر افغانستان کی مذہبی اکثریت کو مطمئن کرنا ہو تو کمیونزم کی خدمت نہ ہو سکے گی، اور اگر کمیونزم کی خدمت کی جائے تو اسلامی اکثریت کو مسلسل کچلنا ہوگا،

لیکن نور محمد ترہ کی صاحب نے کل کی پریس کانفرنس میں یہ جو فرمایا کہ یہ حکومت کمیونزم کی نہیں ہے اور اسلامی بنیادوں پر ہی ریاست کو حسب سابق چلائے گی، روس کی خصوصی سرپرستی میں نہیں جائے گی۔ کسی وقت انتخابات کرائے جائیں گے اور اغلباً حکومت کی کمیونسٹ پارٹی کے علاوہ دوسری جماعتوں کو بھی کام کرنے کا موقع دیا جائے گا، ان باتوں کے پیش نظر مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ذرا صبر سے دیکھا جائے کہ کیا رنگ جاتا ہے اور کیا آتا ہے۔

۴۔ افغانستان میں کمیونسٹ عنصر آہستہ آہستہ پرورش پاتا رہا۔ اس کی آبیاری باہر سے بھی ہوتی ہوگی صدر داؤد نے برسر اقتدار آنے میں اس عنصر سے مدد لی۔ گویا اسے اور مستحکم کر دیا۔ اب معاملہ یہ تھا کہ یہ لوگ صدر داؤد سے قیمت بھی وصول کرنا چاہتے تھے۔ صدر داؤد نے اس سے گریز کیا۔ نتیجہ انقلاب!

اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ عنصر کسی بھی ملک میں رہ کر یہ خدمت انجام دیتا ہے کہ جب موقع ملے قوم کو بیرونی نظریات کے تسلط میں دے دے۔ یہ لوگ شکار کو گھیر گھار کر نشانے پر لانے والے ہیں۔ یہ غلام سازی کا ایک سلسلہ ہے۔

اگر ایسا ہے تو ہر مسلم ملک کو پہلے سے فکر کرنی چاہیے کہ یہ عنصر مضبوط نہ ہونے پائے، ساز باز نہ کر سکے۔

---

[۱] دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان میں براہ راست کمیونزم یا کمیونسٹ حکومت یا کسی کا کمیونسٹ کہلا کر مقبول عوام ہونا ممکن نہیں،

اہم اداروں میں نفوذ نہ کر سکے، اہم عہدوں پر قابض نہ ہو۔

غفلت کی جائے گی تو یہ پوری قوم کو ہاتی جیک کر کے کہیں کا کہیں پہنچا دے گا۔

۴۔ افغانستان کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ وہاں کمیونزم اپنے خاص قسم کے شعبدے بہت زیادہ دکھا سکے۔ نہ وہاں کوئی خاص صنعتی نظام ہے کہ اُسے قومی ملکیت میں لے کر مزدوروں کو کچھ دیر کے لیے یہ خواب دکھایا جائے کہ لو اب سب کچھ تمہارا ہے۔ نہ زرعی نظام ہی کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے، تھوڑی بہت زمینداری ہے، وہ انفرادی ملکیت کے تحت ہے، تھوڑی سی جاگیرداری بھی ہے۔ مگر اتنا بھی نہیں کہ کچھ دیر انقلابی بگولوں سے کھیتوں کی خاک اُڑائی جا سکے۔ افغانستان اپنا پیٹ بھرنے کے لیے غلّہ تک تو پیدا نہیں کر سکتا، دوسری ضروریات تو رہیں الگ۔

پس وہاں کمیونزم کا کھیل دکھانے سے زیادہ اہم یہ ہے کہ رُوس کو توسیع پسندی کے معرکے کے لیے ایک اور "بنکر" مل جائے۔ سو وہ مل گیا ہے۔ روسی سفیر برائے پاکستان کے ارشادات کا لب و لہجہ دیکھ لیجیے جو انہوں نے افریشیا کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پاکستان کی نوآبادی کو احکام سُنائے جا رہے ہیں۔ اصل ہدف گرم پانی کی بندرگاہ کا حصول ہے (یہ سطور چھپنے جا رہی تھیں کہ انٹرویو کی تردید آ گئی)۔

۵۔ روس اور افغانستان کی سفارتی سرگرمیاں ہمارے یہاں کچھ بھی ہوں۔ مختلف لابیز کسی بھی طرح کام کریں، ہمیں کسی ہراس میں پڑ کر ایک ایسے اندیشے کو اپنے اُوپر خواہ مخواہ اوڑھ نہیں لینا چاہیے۔ ہمارے کرنے کے جو صحیح کام ہیں وہ ہمیں کرنے چاہییں، اور بے سوچے سمجھے کوئی غلط قدم نہیں اُٹھانا چاہیے۔ نہ تو رُوس کے خوف سے کوئی حرکت کی جائے، اور نہ رُوس سے اُلجھاؤ پیدا کرنے کا کوئی سبب مہیا کیا جائے۔ ٹھنڈی میانہ رو اسلامی پالیسی ہی میں ہمارا بچاؤ ہے۔

دُور رس نظر سے دیکھا جائے تو جس دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام ہے اس کے چڑھاؤ کا دَور گذر چکا ہے۔ اب جبکہ اندر بھی آویزش ہے اور باہر بھی کھینچا تانی۔ اس کا اتار ہو رہا ہے۔ اور اس اتار کو شاید تیز رفتار بنانے میں عالمِ اسلام کی تحریکاتِ اسلامی کی وہ مقناطیسی لہریں بھی کام کر دکھائیں گی جو چاروں طرف موجود ہیں۔ پاکستان کا محل وقوع ایسا ہے کہ یہاں کوئی خلل واقع ہوا تو پھر پوری دُنیا کے امن کا بحر الکاہل آپس ہی میں ٹکرانے والے کئی طوفان اُٹھا دے گا۔ پاکستان افغانستان کی طرح بند معاشرہ نہیں ہے۔

۶۔ اس انقلاب کے سامنے مسئلہ پختونستان پھر سامنے آیا ہے۔ یہ ایک غیر متعین ہیولیٰ سا ہے ۔

افغانستان کی مختلف حکومتیں اسے استعمال کر کے رخصت ہو گئیں اور ۳۱ سال گذر گئے۔

اچھا ہو کہ ایک بار اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اس مسئلے پر کھلی بحث ہو اور پاک افغان سرحد کے دونوں طرف ریفرنڈم کرا کے دیکھا جائے کہ ہماری کتنی آبادی افغانستان میں جانا چاہتی ہے اور افغانستان سے کتنی تعداد ہمارے یہاں آنا چاہتی ہے اور دونوں کی تعدادوں کے مطابق کتنے کتنے مربع میل علاقے اِدھر سے اُدھر یا اُدھر سے اِدھر ملحق ہونے چاہییں۔

اتنا مبہم اور غیر متعین مسئلہ شاید کبھی وجود میں نہیں آیا۔ اور آیا ہو تو اتنی دیر زندہ نہیں رہا۔ جیسے یہ ایک غبارہ ہے کہ جب چاہا اس میں ہوا بھر لی۔ اور جب چاہا ہوا نکال کر غبارہ تہ کیا اور مال خانے میں رکھ دیا۔ کاشکہ اسلامی اخوت اتنی بھی اہم ہوتی جتنا پختونستان کا غبارہ ہے۔

۷۔ روسی سفیر نے دوستوں کے مسئلے پر کھل کر بات کی ہے۔ اس کا ترجمہ کیا جائے تو یہ ہے کہ ہم سے دوستی رکھنی ہے تو چین سے انقطاع کر لو، مصر اور سعودی عرب اور صومالیہ کو چھوڑ کر لیبیا اور ایتھوپیا سے تعلقات جوڑو، ایران اور ترکی سے کنارہ کر کے عراق اور شام سے ربط رکھو۔

مگر دوستیاں عرصۂ دراز کے تاریخی عمل سے عوام میں نشوونما پاتی ہیں۔ عوام میں جب کچھ ممالک اور اقوام کے لیے اُن کے رویّے کی وجہ سے محبت کے جذبات پیدا ہو جائیں تو کوئی حکومت رائے عام کے مزاج سے ٹکرانا پسند نہیں کرتی۔

کہتے ہیں کہ دوستی مساوی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ یہ اگر صحیح ہے تو روس بھی ہماری پسند و ناپسند کے مطابق تعلقات کا نقشہ کچھ نہ کچھ بدلے۔ کیا ایسا ممکن ہے، اگر نہیں تو ہر چہ بر خود نہ پسندی، بر دیگراں مپسند۔ اصول کوئی ایک ہونا چاہیے۔ اور اس کا اطلاق یکساں۔ کوئی اگر چاہے کہ تمام دوستیاں ہماری مرضی کے مطابق ہونی چاہییں تو اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ دفتر خارجہ کا چارج ہمیں دے دو۔ پھر آخر دفتر داخلہ کو کیسے الگ رکھا جا سکے گا۔

۸۔ بنیادی طور پر ہمارے روس سے بھی دوستانہ تعلقات ہیں، اور افغانستان تو برادر پڑوسی ملک ہے۔ ہم اختلاف تو کر سکتے ہیں، کوئی عناد نہیں رکھتے۔ ہمارا کسی سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ نئے حالات و واقعات کے رُونما ہونے پر اپنے اپنے رنگ کے تاثرات ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ چیزیں دوستانہ سفارتی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات کی نفی نہیں کرتیں۔ پھر کیا یہ کافی نہیں ہے؟

(۳)

ایک صدمۂ جانکاہ کا سامنا کر کے دل تھام ہی رہے تھے کہ مزید ایک خبرِ غم اثر نے روح کے دروازے پر دستک دی۔ سارا قصر احساس لرز اُٹھا۔[1]

ماہر القادری ایڈیٹر فاران ہم سے جدا ہو گئے! ایک چمکتا ستارہ آسمانِ ایمان و ادب سے اور ٹوٹ گرا۔ خانۂ ظلمت میں گھی کے چراغ جلے ہوں تو کیا عجب!

سفر پر نکلنے سے پہلے دو ایک بار ٹیلی فون پر میرے بارے میں بالواسطہ طور سے معلوم کیا کہ آیا مجھے بھی چلنا ہے یا نہیں۔ میری طرف سے انہیں شاید میرا جواب مل گیا ہو کہ مجھے تو طلب ہی نہیں کیا گیا۔ دل میں سوچا کہ اپنی شعر و شاعری بھی کیا، اور ہو بھی تو اپنے جذبہ و تخیل کے حباب مشاعروں کے تیز و تند طوفانوں میں کیا جگہ پائیں گے۔ وہاں تو صدفِ فن کے گوہر مقام پاتے ہیں، یا پھر چٹانوں اور پتھروں کو وزن ملتا ہے کیونکہ وہ گرم و سرد اور موافق و مخالف رووں سے بے نیاز جہاں کے تہاں جمے رہتے ہیں۔

دو ماہ پہلے انہیں انگلینڈ سے برمنگھم کی سیرت کانفرنس (۲۷ تا ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء) کے لیے دعوت نامہ شرکت ملا تھا۔ ماہر صاحب سفر اور سیر کا شوقِ فراواں رکھتے تھے۔ دعوت کو دل سے قبول کر کے وہ خوشی خوشی اپنے کام تیزی سے نمٹانے میں مصروف ہو گئے۔ ماہ رواں کے علاوہ فاران کے مزید دو شماروں کے لیے مضامین جمع کر کے انہیں مرتب کر دیا۔ اسی دوران میں جدہ سے مشاعرہ کا دعوت نامہ ملا۔ خط میں لکھا کہ جدہ جا رہا ہوں، عمرہ و زیارات میں کچھ دن صرف کروں گا اور پھر اگر انگلستان سے ٹکٹ موصول ہو گیا تو آگے چلا جاؤں گا۔ مگر انہیں کسی اور ہی طرف آگے جانا تھا۔ وہ سمندر پار جانے کے بجائے حیاتِ ارضی کی سرحد کے اُس پار چلے گئے۔ اُدھر سے دعوت نامہ اور ٹکٹ پہلے آگیا ؎

جدہ گئے، پھر آگے بہ صحنِ حرم گئے　　پھر اور آگے نکلے تو سوئے ارم گئے

---

[1] اشارات کے جملہ صفحات کتابت ہو کر پریس جا رہے تھے کہ ماہر صاحب کی اچانک وفات کی اطلاع موصول ہوئی دل کے تاثر نے مجبور کیا اور فوری طور پر یہ چند سطور مرحوم کے متعلق لکھی گئیں۔ اشارات کا پورا نقشہ بدل دیا گیا ہے۔ (ت۔ص)

حلقۂ یاراں میں ماہر صاحب کی قد آور شخصیت کو بے حد مرکزی مقام حاصل تھا - وہ نہ صرف اوّل درجے کے شاعر تھے اور فن اور زبان و محاورہ کے راز دان، بلکہ مادّہ پرستانہ دَور نے لامقصدی ادب اور بدن پرست ادب کے جو محاذ پیدا کر دیے تھے اُن کے خلاف جہاد آرا رہے - اس دَور کے مزاج میں ہر روایت میں اندھا دھند بغاوت، ماضی کے خلاف نفرت، اصولوں، ضابطوں اور قدروں کو توڑنے کے لیے ایک نفسیاتی ہیجانی کیفیت کی جو بدبلا پائی جاتی ہے، وہ ایک طرف دین و اخلاق کی بنیادوں کو متزلزل کرتی رہتی ہے۔ اور دوسری طرف تہذیبی اور لسانی معیاریت کو تباہ کرنے میں لگی رہتی ہے۔ ماہر صاحب بھی دوہرا کام کرنے رہے دین و اخلاق کے تحفظ کا جہاد بھی جاری رکھا، اور زبان کو بگاڑنے اور فن کو خراب کرنے کی مہمات کے خلاف بھی بڑی جرأت سے معرکہ آرا رہے۔ دراصل وہ ایک ہی کام تھا جسے وہ دو محاذوں سے انجام دے رہے تھے۔ اُن کی وجہ سے ہماری ادبی سرگرمیوں کا بڑا بھرم قائم تھا۔

دین کے تقاضوں سے حق کہنے میں بے باکی کی وہ ایک روشن مثال تھے۔ پاکستان میں کیسے کیسے مرد افگن دَور گذرے ہیں، مگر ماہر صاحب کا قلم غلام محمد اور سکندر مرزا کے دَور سے لے کر بھٹو صاحب کے زمانے تک سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق بڑی سلیس زبان میں کہتے چلے گئے اور بارہا حکومتوں کے اُٹھائے ہوئے انحرافی مباحث میں تحقیقی مضامین لکھے اور لکھوائے۔ کسی بڑے سے بڑے آدمی کی کوئی ایسی کتاب سامنے آئی جس میں دین کی کسی حقیقت کو مسخ کیا گیا ہو، یا بیجا طور پر حکومت کی خوشامد کے جذبے سے مسائل کو تاویل کے سانچے میں ڈھالا گیا ہو، یا فرقہ وارانہ نزاعات کی گھٹیا سطح پر کوئی نکتہ آرائی کی گئی ہو تو وہ ایک ایک پیرے ایک ایک فقرے اور ایک ایک لفظ کی چیر پھاڑ کر کے چھوٹے سے چھوٹے اجزائے فکر و بیان کو اس طرح نمایاں کر دیتے کہ جیسے کسی محدب شیشے کی مدد سے جراثیم اور وائرس کو بڑا کر کے دیکھا اور دکھایا جاتا ہے۔

ماہر صاحب محض ایک ادبی دانشور ہی نہ تھے، بلکہ وہ تحقیق و مطالعہ کے ساتھ اقامتِ نظامِ حق کے لیے پیش آمدہ مسائل پر مؤثر کلام کرتے تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلامی دستور، اسلامی قانون، اسلامی تہذیب، اسلامی تعلیم اور اسلامی حکومت کے لیے ملک میں جو تحریک اوائلِ قیامِ پاکستان سے چل رہی ہے اس میں ماہر صاحب کا بھرپور حصہ شامل ہے۔ یقیناً اُن کی یہ خدمت خدا کے ہاں وزن و قدر رکھتی ہے۔

ماہر صاحب جوانی میں صبح بنارس جیسی نظمیں لکھنے کے باوجود دل کے مسلمان تھے۔ اور نعت گوئی کی طرف طبعاً اُن کو رغبت تھی۔ ۱۹۵۴ء میں زیارتِ حرمین سے بہرہ مند ہوئے تو اُن کے اندر حمیتِ دین اور محبتِ رسولؐ

کے جذبات کو خاص نشو و نما ملی۔ اس سفر کی کیفیات کا اظہار انہوں نے "کاروانِ حجاز" میں کیا ہے۔ بعد میں یہ رنگ اُن کے ہاں روز بروز گہرا ہوتا گیا۔ اُن کے یہی مقدس جذبات اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے قبول ہوئے کہ بیماری کے کسی لمبے چکر میں پڑے بغیر اپنے قدموں سے چل کر جانِ جانِ آفرین کو سپرد کرنے کے لیے سرزمینِ حجاز میں پہنچے۔ مشاعرہ پڑھنے گئے تھے مگر وہاں ان کا جنازہ پڑھا گیا۔ جنازہ پڑھے جانے کا مقام بیت اللہ شریف تھا تو اس کا وقت نمازِ جمعہ کے بعد مقرر ہوا۔ تدفین مکہ کے قبرستان جنت المعلیٰ میں ہوئی — علامات صاف بتا رہی ہیں کہ اس شخص کو کیا مقام ملا۔

ہم اپنے نقصان کو دیکھ کر روتے ہیں، مگر جس کے ہاتھ میں زندگی و موت کا فیصلہ ہے، اس کی نگاہ خیرِ کُل پر ہے اور خیرِ کُل ہی کے لیے اس کے کچھ قوانین اور سنن ہیں اور ہر جان کی اجل مسمّٰی ہے۔ ہم اُس کے سامنے پورے ایمان و اعتماد کے ساتھ سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور اپنے لیے مقامِ صبر و رضا چاہتے ہیں۔

ماہر صاحب باغ و بہار شخصیت تھے، بذلہ سنج، لطیفہ گو، نکتہ طراز، اپنی خاص طرزِ ترنم کے موجد، مشاعروں کے بادشاہ، خندہ جبیں، احباب نواز، وسیع الروابط، رونقِ مجالس، علم سے بہرہ مند، مطالعہ کے خوگر، شائستہ اطوار، خطوط کا جواب دینے میں نہایت باقاعدہ، لباس اور رہن سہن میں سادگی پسند، غرور سے خالی، بعض معاملات میں بچوں کی طرح بھولے بھالے، اپنی بے اولادی کے تذکرے سے انتہائی مجتنب، اہلیہ کی وفات کے بعد خدمتِ دین و شعر میں پہلے سے زیادہ سرگرم، مرحوم کی کیا کیا خوبیاں عجلت میں لکھے ہوئے اس مختصر نوٹ میں بیان ہوں۔

ذاتی طور پر مجھے ان کا خاص التفات حاصل رہا، اور میری کوتاہیوں اور غفلتوں کے باوجود اُن کی برادر نوازی میں فرق نہیں آیا۔

موجودہ شخصیتوں میں سے سب سے زیادہ محبت و احترام ان کے دل میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے لیے تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی موصوف سے اثر پذیر ہوئے۔ جس زمانے میں وہ فلمی دائرے میں گیت لکھنے (۱۹۴۲ء) کے تجربے میں پڑے۔ اسی زمانے میں اس کام سے ان کے اندر الجھن پیدا ہوئی۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی سے خط و کتابت کی۔ اُن کے ایک خط کا یہ حصّہ مجھے اب تک یاد ہے کہ انہوں نے لکھا تھا کہ مجھے اوسطاً دو ہزار روپے ماہانہ آمدنی ہو رہی ہے۔ اس خط کا جواب اغلباً مولانائے محترم نے میرے ہی ذریعے لکھوا کر بھجوایا تھا۔ اس خط و کتابت کے نتیجے میں فلمی کام چھوڑ دیا، بلکہ انہوں نے آگے بڑھ کر اسلامی

مقاصد کو فن کی رُوح بنانے کا آغاز کر دیا۔ نئے دورِ شاعری میں ان کی ایک عام فہم مگر حقیقت کا عکس پیش کرنے والی نظم قرآن کی فریاد بہت مقبول ہوئی۔ بعد میں اسلامی دستور پر لکھی ہوئی ایک نظم جگہ جگہ مجالس میں پڑھ کر سُنائی جاتی رہی ؏

اپنی منزل، اپنا مقصد اسلامی دستور

اِسی طرح جب سکندر مرزا کا مارشل لا لگا اور جماعت خلاف قانون قرار پائی تو پیرایۂ غزل میں انہوں نے مارشل لا کے آسیبی سائے میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے ابتلاء کو بڑی خوبی سے بیان کیا ؎

شکوۂ آسماں کرتے کرتے رک گیا ہوں فغاں کرتے کرتے
عمر گذری ہے بادِ صبا کی خدمتِ گلستاں کرتے کرتے
ہو نہ جاؤں بہاروں سے بھی بدگماں اعتبارِ خزاں کرتے کرتے

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پہ سیاسی اور دینی دائروں سے جو حملے ہوتے رہے تھے، ان سب کا جواب دینے کے لیے قلم کو نیزے میں بدل لیتے۔ اور اُس کی نوک سے مخالفانہ مواد کا ایسا ناقدانہ تجزیہ کرتے کہ لفظ لفظ بے جان ہو کے رہ جاتا۔ اسی کے ساتھ جب کوئی مقام ایسا ہوتا کہ مولانا کی کسی بات سے، خواہ وہ تفسیر اور فقہ سے متعلق ہو، یا زبان اور محاورے کے بارے میں، اختلاف ہوتا تو بے محابا اس کا اظہار کرتے، خط لکھتے، ملاقاتوں میں گفتگو کرتے، کبھی ان کے مخلصانہ دلائل سے مولانا متاثر ہو کر اپنی بات میں کوئی تبدیلی کر لیتے، اور کبھی ماہر صاحب کو قائل ہونا پڑتا۔ اور کبھی اختلاف اپنی جگہ برقرار رہتا۔ یعنی انتہائی محبت و احترام کے باوجود معاملہ اندھی عقیدت کا نہ تھا۔ مولانا مودودی نے ایسے ہی آدمی بنانے میں عُمر کھپائی ہے۔ محبت کے باوجود اختلاف، اور اختلاف کے باوجود محبت و اتحاد۔

یہ شخصیت جس کی ولادت کیسر ضلع بلند شہر یوپی میں ۳۰ جولائی ۱۹۰۷ء (۱۳۲۴ھ) کو ہوئی اور جس کا تاریخی نام منظور حسین رکھا گیا، ۱۱ مئی ۱۹۷۸ء کو تین بجے شب ہم سے جدا ہو گئی، اگلے دن نماز جمعہ کے ساتھ حرم شریف میں جنازہ پڑھا گیا اور مکہ کے جنت المعلیٰ نامی قبرستان میں تدفین ہوئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن!

رب غفور و ودود، ہمارے اس بزرگ و محبّ رفیق کی رُوح کو اپنی خاص رحمتوں سے مالا مال کرے۔ آمین

(اضافہ از ابوالاعلیٰ) ماہر صاحب مرحوم میرے قدیم ترین دوستوں میں سے تھے۔ تقریباً پچاس سال پہلے میری اور ان کی دوستی کی ابتداء ہوئی تھی جو آخر دم تک قائم رہی۔ مجھ سے ان کی مخلصانہ محبت کے گواہ فاران کے صفحات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اُن کی نیکیوں کو قبول اور لغزشوں کو معاف فرمائے، اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

ایک تجویز

بھارت اور اس کے علاوہ بھی بعض ممالک میں ایک اسکیم "ڈرگ بنک" (یا دواؤں کا بنک) کے نام سے چلتی ہے۔ جس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ شہروں میں تقریباً ہر گھر میں ٹیکے اور گولیاں اور دوسری ادویہ بچی پڑی رہتی ہیں۔ کبھی تو اس وجہ سے کہ ڈاکٹر علاج تبدیل کر دیتے ہیں اور کبھی اس سبب سے کہ پوری ادویہ کے استعمال سے پہلے ہی علاج مکمل ہو جاتا ہے۔

ان ادویہ کو جمع کر کے غریبوں کے علاج میں لگایا جا سکتا ہے۔

اب تک دوسرے ممالک میں یہ اسکیم حکومتی انتظام سے چلائی گئی ہے۔ مگر پاکستان میں اگر جماعت اسلامی کا شعبۂ خدمتِ خلق اس کام کو سنبھال لے تو اخبارات میں وقتاً فوقتاً اشتہار دے کر، ہینڈ بل تقسیم کر کے، جمعہ کے اجتماعات میں مساجد کے اندر اعلانات کر کے پبلک سے یہ اپیل کی جا سکتی ہے کہ جن اصحاب کے ہاں بچی بچائی سکہ بند ادویات پڑی ہوں، وہ فلاں فلاں مراکز میں پہنچا دیں یا پوسٹ کارڈ لکھ کر اطلاع دیں تو ہمارے کارکن خود گھروں پر جا کر وصول کر لیں گے۔

جمع شدہ ادویات کا جائزہ کوالیفائیڈ ڈاکٹر، (اور یونانی ادویہ ہوں تو مستند حکیم) کے ذریعے لیا جائے گا۔ اوّل یہ کہ آیا کوئی ٹیکہ یا دوا اپنی مقررہ میعاد ختم تو نہیں کر چکی۔ وہ اس حالت میں تو نہیں ہے کہ مشکوک ہو چکی ہو اور اس کے استعمال سے ضرر کا اندیشہ ہو یا فائدہ کی اُمید نہ ہو۔ پھر جن دواؤں کو ڈاکٹر یا حکیم صاحبان پاس کر دیں اُن کو گشتی اور قائم شفاخانوں میں موجود رکھا جائے اور اُن کی باقاعدہ فہرست تیار کر لی جائے۔ ایسے غربا جو دواؤں کی قیمت ادا نہ کر سکتے ہوں یا مہنگے ٹیکوں اور ٹیکوں کو بازار سے نہ خرید سکتے ہوں، ان کو ڈرگ بنک سے مفت دوائیں مہیا کی جائیں۔ (نعیم صدیقی)